پروفیسر شارب ردولوی

اشفاق حسین : ایک نیا شعری استعارہ

گذشتہ تیس سال کے عرصے میں اشفاق حسین کے تین شعری مجموعے ''آشیاں گم کردہ'' (۲۰۰۹) ''ہم اجنبی ہیں'' (۱۹۹۲) اور ''اعتبار'' (۱۹۷۹) شائع ہو چکے ہیں۔ اس عرصے میں جہاں انہوں نے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی، وہیں تنقید کے میدان میں بھی فیض احمد فیضؔ پر اپنی چار تصنیفات اور احمد فرازؔ پر اپنی کتاب کے ذریعہ اُردو تنقید کے صفحۂ اوّل پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ اِسے اتفاق کہیں یا اشفاق حسین کے تحت الشعور کی کوئی نفسیاتی گرہ کہ ان کی شاعری اور تنقید کی کتابوں میں اندرونی طور پر ایک قدر مشترک کا احساس ہوتا ہے۔

اشفاق حسین کی شاعری پر لکھنے والوں نے عام طور پر انہیں اُردو کے ''ہجری ادب'' کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے گو کہ میں اس رائے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں، ان کے یہاں دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ اشارے ہجرت اور اس کے اثرات کے نظر آتے ہیں لیکن اسے ''ہجری ادب'' قرار دے کر گزر جانا اس کے خوبصورت رنگوں اور دلکش تراکیب اور عصری سچائیوں کو نظر انداز کرنا ہے، یہ ضرور ہے کہ انہوں نے نثر میں سب سے زیادہ فیض احمد فیضؔ پر لکھا جو طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کے پسندیدہ شاعر رہے ہیں اور اس کے بعد دوسرے مقبول غنائی شاعر احمد فرازؔ پر قلم اُٹھایا۔ یہ دونوں ہی وہ شاعر ہیں جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دیارِ غیر میں سرگرداں یا 'بے گھری' Exile میں گزرا۔ مجھے

اشفاق حسین کے یہاں یہ ذہنی قربت ان تحریروں کا ایک لاشعوری سبب محسوس ہوتی ہے۔

اشفاق حسین کی ذہنی تربیت، ترقی پسند فکر کے سائے میں ہوئی۔ زندگی کیا ہے؟ انسان اور انسان کے درمیان معاشی اور طبقاتی فرق کی یہ لامتناہی خلیج کیسے ہے؟ کچے مکان، گندی گلیاں، مہاجر بستیاں، بھوک، بیکاری اور اس سے پیدا ہونے والی تمام اخلاقی برائیاں کیوں ہیں اور یہ کیسے ختم ہوں گی؟ اس طرح کے نہ جانے کتنے سوال خواب بن کر اشفاق حسین کے ذہن میں جگہ بناتے رہے۔ اس طرح سوچنے اور خواب دیکھنے والے بہت سے نوجوان تھے جو آزادیِ اظہار پر پابندی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکے اور ایک بار پھر ''لاد چلنے'' کو تو کچھ نہیں تھا اس لیے 'تلاشِ سحر' میں 'بنجارے' یوں ہی نکل پڑے۔ اپنی زبان اور تہذیبی اقدار سے دوری، حساس انسان کے لیے عیش و آرام کی تمام فراہمی کے باوجود ایک مسلسل کرب ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لیے کسی نسل کو پہلی بار ہجرت کے عمل سے گزرنا پڑا ہو، ہمیشہ ہر عہد میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ میر تقی میرؔ، غالبؔ، مرزا رفیع سوداؔ، نظیر اکبرآبادی، انشاءؔ، مصحفیؔ سب نے ہی مختلف شہروں کی کوچہ گردی کی۔ اور اپنی اپنی جگہوں کو چھوڑنے کا غم انہیں رہا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے ساتھ زبان اور تہذیب سے دوری اور بالکل اجنبی ماحول میں زندگی گزارنے کا المیہ نہیں تھا جو آج کی نسل کو جھیلنا پڑا اور جس کا کرب بار بار شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کے اشعار اور تحریر میں نظر آجاتا ہے۔ اشفاق حسین کی شاعری بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں ؎

کیوں میری جڑیں جا کے زمیں سے نہیں ملتیں
گملے کی طرح صحن میں رکھا ہوا کیوں ہوں

بدن سے لپٹے رہے بے زمینیوں کے عذاب
تلاشِ رزق کی خاطر جدھر جدھر بھی گئے

کہیں بھی جاکے بسیرا کریں اُدھر ہی کے ہیں
ہمارے سارے حوالے ہمارے گھر ہی کے ہیں

تمام رشتے اُسی شاخ بے ثمر سے ہیں
تلاش انہیں کو ہے گھر کی جو نکلے گھر سے ہیں
شناخت کی یہ کہانی بس ایک نسل کی ہے
پھر اس کے بعد فسانے اِدھر اُدھر سے ہیں

کیسے ترسیل سخن کی کوئی صورت نکلے
یہ زباں میری نہیں ہے نہ یہ لہجہ میرا

جس کسی کو بھی کسی مجبوری یا بہتر ذریعۂ معاش کے وسائل کی تلاش میں اپنی زمینیں چھوڑنی پڑیں ان کے یہاں ایک عرصے تک تو اس تشنگی کا احساس رہتا ہے، پھر وہ اسی ماحول، اسی آب و ہوا کا حصہ بن جاتے ہیں اور شاید یہ احساس بھی کم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے کچھ کھو کر اُسے پایا ہے۔ Positive Attitute یا ترقی پسند نظریۂ زندگی بھی یہی ہے۔

اشفاق حسین ترقی پسند شعری فکر کے ان نئے معماروں میں ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو خراب سماجی اور سیاسی حالات میں بھی شکستگی، خوف اور مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں ایک واضح فکر اور زندگی کا ایک نظریہ ہے۔ ہجرت کو انہوں نے 'بیماری' کی طرح طاری نہیں ہونے دیا بلکہ زندگی اور فکر کے ایک 'سفری پڑاؤ' کی صورت میں لیا۔ لیکن جب یہی 'سفری پڑاؤ' مستقل ہو گیا اور ع:

از بنارس نہ رَوَم معبدِ عام است اینجا

کی صورت پیدا ہو گئی تو ان کی نگاہیں ''میپل'' کے سنہرے ہوتے ہوئے پتوں اور فرش پر دھنی ہوئی روئی جیسی بچھی ہوئی سفید چادر کے حسن پر جم گئیں۔ یہ ایک بہت بڑا فرق مجھے اشفاق حسین اور دوسرے شعراء کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اشفاق حسین نے جبراً کسی چیز کو قبول نہیں کیا، ان کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی کو اس کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے نہ کہ صرف جذباتی ردّعمل کا شکار ہوا جائے اور ان پر ماتم کرتا رہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں جا بجا اشارے مل جاتے ہیں ؎

نئی دنیا، نئے منظر، نئے افکار ملے
سب شجر نقل مکانی کے ثمر بار ملے
بادِ ہجرت تو ہمیں لے کے جہاں آئی ہے
اُن گلی کوچوں میں انسانوں کے شہکار ملے

یہ زندگی کا ایک مثبت رویّہ ہے اور یہی آج کی ترقی پسندی کی علامت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اشفاق حسین کو اپنا شہر، اپنی گلی، اپنے مکان کی دیواریں اور آنگن، اپنے یاروں اور دوستوں کے جمگھٹ کے چھوٹنے کا دُکھ نہیں ہے۔ وہ ایک حساس شاعر ہیں، اس لیے شاید اس دُکھ کی شدت کو وہ جتنا محسوس کر سکتے ہیں، دوسرا محسوس نہیں کر سکتا، لیکن ان کا رویّہ دوسرا ہے وہ 'تخریب' میں بھی تعمیر کے مضمر پہلوؤں کو

دیکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

مرے پاؤں کے نیچے بھی زمیں ہے
مجھے ہجرت کا کوئی دُکھ نہیں ہے
کبھی ناآشنا تھے سارے رَستے
مگر ہر راستہ اب دل نشیں ہے

دل اجنبی دیس میں لگا ہے
جینے کا نیا ہنر ملا ہے
ٹوٹے ہوئے لوگ ہیں سلامت
یہ نقل وطن کا معجزہ ہے

اس عہد کی ہے یہ اک ضرورت
ہجرت کوئی سانحہ نہیں ہے

بے گھر کیا کتنی خواہشوں کو
اپنے لیے ایک گھر بنا کر
کاٹی ہے یہ فصل میں نے کیسی
خوابوں کی زمیں پہ ہل چلا کر

اجنبی دیس میں جینے کے نئے ہنر سے شناسائی اور ہجرت کو اس عہد کی ایک ضرورت قرار دینا اشفاق حسین کی زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی نفسیات پر ان کی گہری نظر ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں ہجرت کا کوئی دُکھ نہیں ہے اور وہ سارے نا آشنا راستے اب ان کے دلنشیں راستے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ ۔

ہجرت کی منزلوں میں ہر اک خاندان کی
اک نسل مطمئن ہے مگر اِک اُداس ہے

اس کے باوجود نئی سرزمین، بیگانگی کے باوجود نئی طرح جینے کا ہنر سکھا دیتی ہے۔ اشفاق حسین نے کس خوبصورتی کے ساتھ ایک شعر میں یہی بات نظم کی ہے ۔

دل اک نئی دنیائے معانی سے ملا ہے
یہ پھل بھی ہمیں نقل مکانی سے ملا ہے

اشفاق حسین نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی، ان کی بعض نظمیں بہت خوبصورت ہیں، لیکن غزل کا جو سلیقہ اشفاق حسین کے یہاں ہے، وہ ان دنوں بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے وقت جس خاص بات کا احساس ہوتا ہے وہ ان کا اپنا رنگ شعر ہے۔ وہ ترقی پسند ہیں اور اُس وقت کے ترقی پسند شاعروں میں سب سے زیادہ فیضؔ سے متاثر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجازؔ، کیفیؔ، نیازؔ حیدر جانثار اخترؔ، جذبی کی وہ آوازیں تھیں جنھوں نے اظہار و بیان میں اس وقت کے شعراء کو متاثر کیا۔ اور ان کے لہجے کا اثر نئی نسل کے شعراء کے یہاں کہیں نہ کہیں ضرور نظر آجاتا ہے لیکن اشفاق حسین کی شاعری میں فیض کی رومانیت کہیں نظر آتی ہے اور نہ سردار کیفی اور نیاز حیدر کی بلند آہنگی، بلکہ ان کے یہاں ایک خاص طرح کی نرمی، شگفتگی اور آہستہ بیانی ہے۔ وہ احساس

اور خیال کی ندرت کو ایسی تہہ داری اور آسانی کے ساتھ نظم کر دیئے ہیں، جس میں گفتگو اور شیریں بیانی دونوں کا لطف یکجا ہو جاتا ہے۔

میں نے کسی جگہ یہ بات لکھی ہے کہ اشفاق حسین کا اپنا ایک نقطۂ نظر، چیزوں کے دیکھنے کا ہے، ان کی نظموں اور غزلوں کی پہلی قرأت میں ایک اُداسی اور غم کی زیریں لہر کا احساس ہو سکتا ہے، لیکن اگر ذرا سی توجہ دیں تو اس سے بھی رجائیت اور اُمید کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوں گی۔ وہ نہ اس کا اعلان کرتے ہیں اور نہ کسی سیاسی نظریے سے اس کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ بالکل ایک عام انسان کی طرح سوچتے ہیں اور دل پر گزرنے والی کیفیت یا واردات کو بے ساختگی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں جو ان کی غزلوں اور نظموں میں گہرا تاثر پیدا کر دیتی ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے جو بظاہر بالکل سادہ ہیں، لیکن ان کے اندر گہری عصری معنویت پوشیدہ ہے ۔

ابھی سے کیوں بجھا دیں، اپنے دل کی ساری شمعیں
سحر ہونے تک امکانِ سحر باقی رہے گا
جو تم چاہو تو اس برتن کو چکنا چور کر دو
مگر پھر بھی نشانِ کوزہ گر باقی رہے گا

ان اشعار کا بلیغ انداز اور کیفیت اپنے کلاسیکی اہتمام کے باوجود عصری تقاضوں کی ایسی تصویر ہے جس کے اثر سے نکل پانا مشکل ہے۔

اشفاق حسین کی شاعری عصری تقاضوں کی شاعری ہے۔ آج زندگی کن راہوں سے گزر کر کہاں تک پہنچی ہے اور آج کا انسان اس کے بارے میں کس طرح سے سوچتا ہے۔ اس کے بیان کے لیے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ اشفاق حسین لفظوں کے مزاج کو بڑی اچھی طرح پہچانتے ہیں اور اسے فکر سے ہم آہنگ کرنا

بھی جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی نسل اور موجودہ نسل دونوں سے ان کے فکری زاویے مختلف ہیں اور وہ بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ اپنی بات کہہ دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔ آج کا انسان کن حالات سے گزر رہا ہے، اس کی جدوجہد اور اس کے خوابوں کے ٹوٹنے سنورنے اور بکھرنے کے عمل کو ان اشعار میں دیکھئے ۔

نرم زمیں اور پانی کے محتاج نہیں ہیں ہم
ہم تو وہ کونپل ہیں جو پتھر سے نکلے ہیں

خیال و خواب کے دریا کے پار اُتر بھی گئے
جدھر ہمیں نہیں جانا تھا ہم اُدھر بھی گئے

اور اسی غزل کا یہ شعر دیکھیے ۔

وہ سارے خواب زدہ لوگ اپنے خواب کے ساتھ
سنورتے رہنے کے امکان میں بکھر بھی گئے

خواب زدہ لوگ کی ترکیب پر ایک نگاہ ڈالیے تو دوسرے مصرعے تک پہنچتے پہنچتے ایک پورے عہد اور ایک نہیں کئی نسلوں کی تاریخ سامنے آجائے گی۔ اس شعر کی تفصیل میں جا کر میں اس کے حسن کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔

اشفاق حسین کی ذہنی تربیت ایک خاص طرح کے رومان اور انقلابی تصورات کے سائے میں ہوئی لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ان کے یہاں نہ تو اس طرح کی رومانیت نظر آتی ہے اور نہ انقلاب کا وہ تصور ملتا ہے جو اس عہد کے بیشتر شاعروں کی خصوصیت میں شمار ہوتا ہے۔ اشفاق حسین کے اشعار ایک بے

ساختہ عمل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس میں نہ تو کسی طرح کا تصنع ہے اور نہ مضمون آفرینی یہ چھوٹی چھوٹی تصویریں ہیں۔ Miniature Paintings کی طرح جن کا اپنا ایک حسن ہے ۔

جب دل کی گواہی کا مقام آ ہی گیا تب
کس راہ پہ چلنا ہے یہ سوچا نہیں کرتے

گرتی ہے تو گر جائے یہ دیوار سکوں بھی
جینے کے لیے چاہیے تھوڑا سا جنوں بھی

نہ جانے مجھ سے کتنے لوگ تھے جو سوچتے یہ تھے
کہ ان سے اک نئی تاریخ کا آغاز ہونا تھا

یہ پاؤں رک گئے کیوں بے نشان منزل پر
یہاں سے اک نیا رستہ نکالنا تھا مجھے

نئی نسل نے عصری تقاضوں کے تحت تاریخ کے نئے صفحات بھی تحریر کیے اور نئے راستے بھی نکالے۔ ان راستوں کی منزل کیا تھی اور کون اپنی منزل پر مطمئن پہنچا اور کون کون سفر میں منزل کی شناخت کھو بیٹھا، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اشفاق حسین ہوں یا ان کی طرح کے دوسرے شاعر انہیں اسی فکری اور سماجی پس منظر میں دیکھنا ہوگا اور ان کے تعین قدر کے لیے ہندوستان یا پاکستان کی نئی نسل کے مروجہ

اُصولوں کو بدلنا ہوگا، ورنہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ ایک بات اشفاق حسین کے کلام کو دیکھ کر بہت واضح ہے کہ ان کے فکری پیمانے اور ان کی عصری حسّیت ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کی عصری حسّیت سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے اگر اشفاق حسین کے کلام کی Sociological Study سماجیاتی مطالعہ کرنے کی کوشش کی جائے تو جغرافیائی حالات، بدلے ہوئے موسموں کی خوشبو اور عصری تقاضے کچھ دوسرا ہی منظر نامہ لیے ہوئے دکھائی دیں گے۔ اُردو شاعری نے دجلہ و فرات کے سائے میں پرورش پائی۔ 'قاف' کے حسن کی گرویدہ رہی۔ راوی و چناب کے عشق کے قصّے سناتی رہی۔ شامِ اودھ اور صبحِ بنارس کی رنگینیوں پر فدا رہی، لیکن ایک نسل کے لیے یہ سارے منظر بدل گئے، اس لیے اُسے نئے رنگ اور نئے احساس کی گرمی میں تلاش کرنا ہوگا۔ اشفاق حسین کو ان کے الفاظ کے پس منظر میں اگر تلاش کریں تو یہ فرق بہت آسانی سے واضح ہو جاتا ہے ۔

یہ صبح کی آغوش میں کھلتا ہوا منظر
اک سلسلۂ شب کی گرانی سے ملا ہے

اُسی زمین اسی آسماں کے ساتھ رہے
جہاں کے تھے ہی نہیں اُس جہاں کے ساتھ رہے
نئی زمیں پہ کھلاتے رہے شناخت کے پھول
جہاں رہے وہاں اپنی زباں کے ساتھ رہے
ہم اپنے لمحۂ موجود کے حوالوں سے
غبار قافلۂ رفتگاں کے ساتھ رہے

کوئی گھر ہی نہیں تو بے گھری کا زخم کیسا
سکونت کے لیے اک استعارہ ڈھونڈتے ہیں
یہ دریا زندگی کا پار کیسے ہو کہ جب ہم
کنارے پر کھڑے ہیں اور کنارا ڈھونڈتے ہیں

پیپل کے درختوں میں کبھی چاندنی اٹکے
سورج کی تپش برف کی تحریر میں آئے

زمانے اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود یہ اعتماد اور رجائیت اشفاق حسین کے یہاں اسی زمینی سچائی کا احساس دلاتی ہے جس کا دامن ان سے کبھی نہیں چھوٹتا۔ ان کی شاعری میں وقتی سانحے اور حادثات بھی نظر آتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایک بیدار ذہن شاعر اپنے اِردگرد ہونے والے حالات سے کس طرح چشم پوشی کرسکتا ہے، لیکن اُن کا بیان بھی ان کے یہاں صرف زندگی کے ایک تجربے یا مشاہدے کی شکل میں یا ''بیانِ واقعہ'' کی صورت میں نہیں آتا بلکہ وہ بھی ان کے لیے ایک جمالیاتی اور شعری تجربہ ہے، اسی لیے اشفاق حسین کی شاعری صرف اپنے عہد کی آواز نہیں بلکہ ترقی پسند فکر اور جمالیاتی احساس کا نیا شعری استعارہ ہے جو الفاظ کو فن پارے میں تبدیل کرتی ہے۔ اشفاق حسین ایک کم گو شاعر ہیں لیکن ان کی غزلیں اور نظمیں اپنی کمّیت کے باوجود وہ کیفیت رکھتی ہیں، جس کا اثر تا دیر قائم رہتا ہے۔